AL-JAMEI Research Journal
ISSN (Print) 3006-4775 (Online) 3006-4783

https://aljamei.com/index.php/ajrj

Feminist Consciousness, Identity, and Resistance in Sabeen Ali's Short Storytelling

سبین علی کی افسانہ نگاری میں تانیثی شعور، شناخت اور مزاحمت کے عناصر

Dr Shabbir Hussain
Assistant Professor, Faculty of Oriental Learning,
Lower Mall Campus, University of Education, Lahore
Sadia Ijaz
PhD Scholar, Department of Urdu,
Lower Mall Campus, University of Education, Lahore

Abstract:

Sabeen Ali's short stories skillfully blend modernity with tradition, offering deep insights into life, identity, culture, and social justice. Drawing from her cosmopolitan experiences, Ali's narratives challenge patriarchal structures, elevate marginalized voices, and advocate for conscious, inclusive upbringing. Through nuanced depictions of Pakistani society, her works reveal the complex intersections of gender, class, and social injustice, highlighting the lived realities of women and other oppressed groups. Ali's feminist narrative resistance is central to her writing, as she uses symbolism and literary activism to critique and subvert patriarchal ideologies, presenting characters who resist conformity and seek empowerment. This analysis examines Ali's contributions to Urdu literature, exploring how her works not only expand the scope of feminist theory but also provoke critical reflection on the socio-political landscape of contemporary Pakistan. By emphasizing the importance of feminist intervention, Ali's writing encourages empathy, social consciousness, and action. Her literature serves as a powerful tool for social change, urging readers to confront the pressing issues of inequality, discrimination, and injustice. Ali's literary voice underscores the urgency of challenging oppressive systems and demonstrates the transformative potential of literature in shaping a more just and equitable society.

Keywords: *Sabeen Ali, feminist narrative, social justice, Urdu literature, patriarchal norms, intersectionality, literary activism.*

تعارف:

سبین علی کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے. ان کی افسانہ نگاری موضوع اور کرافٹ کی سطح پر جدید بھی ہے اور اپنی کلاسیک سے بھی جڑی ہوئی بھی۔ یہ جڑت نہ صرف موضوعاتی سطح پر ہے بلکہ خیالات کی سطح پر بھی نمایاں ہیں۔ عام طور یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی بھی لکھاری کے ذاتی مشاہدات کا ایک بڑا حصہ اس کی تخلیقات میں آئینہ ہوتا ہے۔ یہ عمل ضروری بھی ہے ورنہ مطالعہ سے اخذ ہونے والا ادب، ادب برائے ادب کی ذیل میں چلا جاتا ہے اور اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ سبین علی کے افسانے اپنے مشاہدات اور اپنی ذاتی فکر سے جنم لیتے ہیں۔ سبین علی کو نہ صرف پاکستانی سماج میں رائج کلچر کا علم ہے بلکہ وہ غیر ملکی طرزِ حیات کا بھی تجربہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کم و بیش بیس برس دیارِ غیر میں گزارے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مشاہدات وسعت آشنا ہوئے ہیں۔ زندگی کے انہیں مشاہدات سے ہی سبین علی کی کہانیوں کے موضوعات جنم لیتے ہیں۔ ادب سے گہری دلچسپی اور لمبی رفاقت نے انہیں افسانہ نگاری کے فن میں طاق کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں علامت، استعارے، اساطیر اور جدید افسانہ نگاری کے اسرار و رموز جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سبین علی کی کہانیاں محض فکری مشقیں نہیں ہیں بلکہ ان کی ذاتی زندگی کے تجربات کی گہری عکاسی کرتی ہیں۔ اس کی کہانیاں علامتوں، استعاروں اور اشارے سے مالا مال ہیں، اور اس نے جدید کہانی سنانے کے ہنر کو مکمل کیا ہے۔

"گلِ مصلوب" سبین علی کا افسانوں کا مجموعہ جس میں موجود تمام افسانے قاری کو مقصدیت کی طرف راغب کرتے ہیں۔ وہ معاشرے میں پھیلی ناانصافیوں، سماجی برائیوں، قدامت پرستیوں اور غیر انسانی رویوں سے برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر اعلیٰ انسانی طرزِ حیات اختیار کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ وہ ہوس پرستی اور عریانی سے کافی دور ہیں۔ ان کے افسانوں قاری کی ایسی شعوری تربیت کرتے ہیں جو اسے زندگے کو بامقصد بنانے پر اکساتی ہے۔

ان کا افسانہ گلِ مصلوب عہد حاضر کے حالات و واقعات کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ جس میں ایک ایسی عورت کو دکھایا گیا ہے جس کا خاوند انگلینڈ میں روزی کے سلسلے میں مقیم ہے اور وہ یہاں پاکستان میں سات برس سے اپنی بیٹی کے ہمراہ اس کی راہ تک رہی ہے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ صرف ایک ماہ ہی رہ پاتی ہے کہ اس کے بعد ایک طویل ہجر کا سامنا کرتی ہے۔ ہماری معاشرتی جہالت اسے آخر کار سائیکو بنا دیتی ہے۔ ایک خوبصورت اور جوان خاتون بغیر کوئی قصور کیے رائیگاں ہو جاتی ہے۔ یہ المیہ ہے کہ اس کی جہالت معصوم لوگوں کی زندگیاں بغیر کسی وجہ کے نگل لیتی ہے۔ گل مصلوب میں مشابہتی عمل سے اس صورتِ حال کو خوب واضح کیا گیا ہے۔ سبین علی کا یہ افسانہ یوں ہے جیسے کوئی سوزن ایک مالا پروئے جا رہی ہو جو دلوں سے دھاگہ گزارتے کام جاری رکھے ہو۔۔ اقتباس دیکھیں:

> "کوئی چھ سال بعد کی بات ہے، میں ہسپتال کے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھی آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ چند سیٹیں دور ایک خاتون کا چہرہ مجھے مانوس لگ رہا تھا جیسے میں نے انہیں کہیں دیکھا ہو۔ اس کے ساتھ غالباً اس کا ادھیڑ عمر شوہر بھی تھا جس کے سر کے بیچ گنج پنہاں نمایاں تھا۔ اپنے چہرے مہرے اور لباس سے وہ کسی دوسرے ملک سے آیا معلوم ہوتا

تھا۔ خاتون کے چہرے اور سبز نیلگوں آنکھوں کی چمک ماند تھی۔ مجھے وہ برسوں کی مریضہ لگ رہی تھی۔ کافی دیر تک میں یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کہاں دیکھا ہے پھر اچانک کچھ یاد آنے پر فون میں فوٹوز کے فولڈر میں پرانی تصویریں تلاش کرنے لگی۔ پشن فروٹ کے کاسنی پھولوں کی تصویروں کے بیچ ہاتھ سے کڑھائی کی ہوئی چادر اوڑھے سبز آنکھوں والی ایک خوبصورت عورت کی تصویر سامنے آئی۔ ہاں یہ وہی ہے۔۔۔۔۔۔ میں اسے ملنا چاہتی تھی مگر اسی دوران ماہر نفسیات کے کمرے سے اس کا نام لے کر پکارا گیا اور وہ کسی معمول کی مانند چلتی ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے کاسنی رنگ کے پشن فلاور سے سرخ لہور سنے لگا ہو۔"(1)

ھمارے معاشرے میں ہر تیسرے گھر کی کہانی اس سے مشابہہ ہے۔ ملک میں بیروزگاری عروج پر ہونے کی وجہ سے نوجوانوں کو باہر بھیج دیا جاتا ہے اور وہ باہر جا کر دن رات پیسہ کمانے میں خرچ ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کا وہ خوبصورت حصہ جو انہیں اپنے پیاروں کے ساتھ گزارنا چاہئے، پردیس کی نذر ہو جاتا ہے۔ سبین علی نے بیس سال خود پردیس کاٹا ہے اس لیے اس افسانے میں ان کے مشاہدات پوری کیفیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اسی سبب انہوں نے اپنے افسانوی مجموعے کا نام "گل مصلوب" رکھا۔ یہ وہ درد ہے جو پیچھے انتظار میں رہنے والوں کی جوانی کھا جاتا ہے اور ہمارے معاشرے کی بے حسی اور جہالت صرف نوٹوں کی گنتی کرتی رہتی ہے۔ اپنے پیاروں سے دوری انہیں نگل جاتی ہے۔ جب تک وہ کار آمد رہتے ہیں ان سے پیسہ کمانے والی جنس کا سلوک کیا جاتا ہے اور ناکارہ ہونے پر کوئی نہیں پوچھتا ہے۔

سبین علی نے اپنے افسانوں میں بے روزگاری کے عفریت لیے ہوئے ملک میں رہنے کی جدوجہد کو اجاگر کیا گیا ہے، جہاں نوجوان اپنی ذاتی زندگیوں اور رشتوں کی قربانیاں دے کر روزی کمانے کے لیے بیرون ملک جانے پر مجبور ہیں۔ سبین علی کا اس درد کا ذاتی تجربہ ان کی کہانیوں میں جھلکتا ہے۔ سبین علی کے سارے افسانے اپنے موضوعات اور کیفیات کے اعتبار سے اپنی الگ الگ فضا بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "سرنگ کے راستے" ان کا ایک اپنی نوعیت کا اساطیری افسانہ ہے جس مین کرداروں کو استعاراتی طور پر دکھایا جاتا ہے ایک لڑکی خواب میں ایک ایسی غار میں داخل ہو جاتی ہے جس کے کناروں پر روشنی کے قمقمے جل رہے ہوتے ہیں۔ بظاہر اسے ایسا لگتا ہے لیکن قریب جا کر پتا چلتا ہے کہ یہ قمقمے نہیں بلکہ قندیلیں ہیں جو غار کے دونوں طرف جلائی گئی ہیں۔ اس غار میں اساطیری کرداروں کی روشنی میں استعاراتی پر اس کی بہت سے کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے

جن سے اپنی نوعیت یعنی طرزِ حیات، طبقے اور شعبہ کے اعتبار مکالمے سامنے آتے ہیں۔ پہلے مکالمے میں استعاراتی طور پر ایک گاؤں کی لڑکی دکھائی جاتی ہے جسے محبت کی پاداش میں ستی جیسے ظلم سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کا نام کاکاؤ ہوتا ہے جس سے کیکر کے پولوں کی خوشبو آتی ہے۔ دوسری عورت جو اسے غار میں ملتی ہے وہ غربت کی ماری ایک بدحال عورت ہوتی ہے جس سے اس کا مکالمہ نہیں ہو پاتا اور اس افسانے کا تیسرا کردار ایک ایسی فیمانزم عورت کا ہے جو اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنا چاہتی ہے لیکن زمانہ اس کی آزادی کو بے حیائی سمجھتا ہے۔ وہ ایک خوبصورت ویٹرس ہے۔ جسے زمانہ عبرتی عینک سے دیکھتا ہے مگر وہ باوقار انداز میں اپنے نظریات پر قائم ہے اور اسے زندگی پر فخر ہے اور اس غار کا چوتھا کردار مشرقی سوچ کی لڑکی ہے جو پڑھنے لکھنے کے بعد خانہ داری سمجھال لیتی ہے جو کہ اس معاشرے کا روایتی مگر حالات حال پر مبنی کردار ہے۔ جس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے جسے کچھ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"ہاں میں اسے کچھ کچھ پہچان پا رہی ہوں۔ میرے دائیں جانب چلنے والی شاہد فریال ہے۔ وہی فریال جس نے انجینئرنگ کالج میں بہترین تعلیمی کارکردگی کا پچاس سالہ ریکارڈ توڑا تھا ہر جونیئر لڑکی کی آئیڈیل فریال۔[2]

اس متوسط گھرانے کی لڑکی کو کالج میں ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کر لیتا ہے تو اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ پسند کی شادی کے بعد اسے گھر داری، بچوں اور سسرال کے ساتھ اعلیٰ اقدار نبھاتے یہ بھول ہی گیا کہ کامیاب بزنس مین اور انجینئر کی بیوی خود بھی ایک انجینئر تھی۔

اس افسانے میں عورت کے لیے یہ معاشرہ ایک روشن غار جیسا ہی ہے جس میں ہر سطح پر اس کا استحصال ہی ہو رہا ہے۔ گاؤں سے لے کر روشن شہر تک مختلف انداز میں عورت کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ عورت ہر کردار میں ایک ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہے۔

فنی سطح پر بھی یہ افسانہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے وہ آرٹ میں سب سے مقبول ہے یعنی علامت نگاری۔ افسانہ نگار ایک تصوراتی غار بناتی ہے جسے ہمارے معاشرے سے مشابہت کے ذریعے جوڑا گیا ہے اور دوسری طرف ہم اسے دیکھیں تو یہ افسانہ ہمیں ایسا علامتی افسانہ لگتا ہے جس میں تمام تر عصری مسائل اشارات کی صورت پائے جاتے ہیں۔ سید محمد عقیل "اردو افسانے کی نئی تنقید" میں رقمطراز ہیں:

"کہانی آج چکنی سطح اور سیدھے راستے کی کہانی نہیں رہ گئی اس لیے سیدھی رومانیوت اور سادہ حقیقت نگاریاں، اس سے دور جا چکی ہیں۔ قاری جسے معنوی بُعد سمجھتا ہے، وہ زندگی، ذہن، برتاؤ اور مسائل حیات کا آپس کا بعد ہے۔"[3]

یہ بات درست ہے کہ سماج اور زمانہ اپنے چلن میں بہت کچھ تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ زمانے کے اس ارتقاء سے کچھ لوگ خوف زدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے خوف زدہ ہون کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ زمانے کی رفتار سے ٹھیک طور پر ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ اس لیے وہ پرانی قدروں کو ہی موجودہ قدروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک اور معاشرے عام طور پر ہمیشہ حالتِ جنگ میں رہتے ہیں۔ ان میں قدامت پسند سوچ عورتوں پر اپنی اجارہ داری کو نہ صرف اپنا حق سمجھتی ہے بلکہ اس پر فخر بھی محسوس کرتی ہے۔ ناحق لوگوں کا خون بہانا بہادری سمجھا جاتا ہے۔ اسی معاشرے میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو امن اور تعلیم کو ہی وقار سمجھتے ہیں۔ "طلوع ماہتاب" بھی وطنِ عزیز کے ایسے ہی ایک قبیلے کی کہانی ہے جو وزیرستان میں آباد ہے اور ایک کم عمر پختون لڑکی کو بائیس ہزار کے عوض ایک بوڑھے آدمی کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ کچھ دن کے بعد وہ بوڑھا آدمی شدید بیمار ہو کر بستر سے جا لگتا ہے اور بچوں سمیت گھر کی ساری ذمہ داری اس معصوم کے کاندھوں پر آن پڑتی ہے۔ وہ گھروں میں کام کر کے گھر چلاتی ہے اور آخر ایک دن اس کا بیمار ضعیف شوہر بھی جان کی بازی ہار جاتا ہے۔ زمانے کی تند و تیز ہوائیں اسے بہادر بنا دیتی ہیں، اسے دوسرے گھروں میں کام کے دوران بعض اوقات عزت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ لیکن وہ اسے گناہ نہیں سمجھتی بلکہ وہ گناہ اور ثواب کے بیچ موجود معاشرتی ناہمواریوں کو اس سب کا سبب جانتی ہے۔ تاہم اس سب استحصال کے باوجود وہ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتی ہے اور باوقار مستقبل کے خواب دیکھتی ہے۔

اسی اثنا میں اس کی شادی جس نئے جوان سے کی جاتی ہے وہ دہشت گرد سرگرمیوں میں ملوث دکھایا گیا ہے۔ دہشت گرد اسے اسلام اور غیرت کے نام پر استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور اس جیسے جانے کتنے نوجوانوں کو وہ اسلام کے نام پر جنگ میں جھونک چکے ہوتے ہیں۔ ایک رات جب وہ اپنے دہشت گرد گروپ میں گھر میں داخل ہوتا ہے تو صبح گاؤں میں بہت سے لوگ شہید ہو چکے ہوتے ہیں اور دوسری بار ایسا کرنے سے پہلے ہی وہ پاک فوج کے جوانوں کو ان کی خبر کرتی ہے اس کا شوہر اور اس کے ساتھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ سکھ کا سانس لیتی ہے اور اس کے لبوں پر پھر سے یہ نغمہ جاری ہو جاتا ہے:

"اے تارے طلوع ہو
اپنی چاندنی بکھیرو
تارے تمہارے ہمرکاب
روشنی کا ورد کریں"(4)

جب معاشرے میں ہر طرف تاریکی کے بادل چھائے ہوں تو طلوع مہتاب جیسی کہانیاں ہی روشنی کا کام دیتی ہیں۔ ایسی روشنی جو تیز ہوا میں جلتے ہوئے چراغ کی مانند ہوا کرتی ہے۔ زرنمونے جیسی عورتوں کی امید بندھاتی ہیں اور ان کے مستبل میں شعور کی قندیلیں روشن ہونے لگتی ہیں اور وہ جوان جو گمراہی اور تاریکی میں ڈوبے ہوتے ہیں انہیں روشن راستے کا سراغ ملتا ہے۔ وہ بندوق پھینک کر قلم اٹھاتے ہیں۔ تعلیم انہیں پھر سے جانور سے عظیم انسانوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے اور یہی ایک مصنف کی ذمہ داری ہے۔

"شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے"(5)

ایک حقیقی تخلیق کار اپنے معروض سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اس کا مشاہدہ کرتا ہے بل کہ اسے تخلیقی احساس کی سطح پر محسوس بھی کرتا ہے۔

"نیا افسانہ نگار اپنے آپ کو نئے زمانے کی حیثیت سے الگ نہیں کر سکتا۔ اور س کے صادق اظہار کے لیے وہ اظہار و اسلوب کے نئے نئے سانچے تراشتا اور فن کی ایک نئی تمثیلی، تحریری یا علامتی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"(6)

اس سبب سبین علی بہ طور افسانہ نگار اپنے موضوعات، فنی اور فکری سطح پر ایک اہم تخلیق کار کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری میں وہ تمام خوبیاں جو انور سدید جیسے اہم نقاد اور دیگر بہت سے نقادوں کو متاثر کرتی ہیں۔ اُن کی افسانہ نگاری میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے جہاں علامتی افسانے اور جدید افسانے لکھے ہیں وہاں عام قاری کے لیے روایتی افسانے بھی لکھے ہیں جن میں ایک سیدھی سی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ یہ سیدھی سی کہانی بھی اتنی سیدھی نہیں ہے یہ بھی اپنے اندر مکمل تخلیقی شعور سموئے ہوئے ہے۔ متوسط طبقے کی کہانیاں دراصل اس کی سادہ سوچ کی طرح سادہ اسلوب میں ہی پیش کی گئی ہیں۔ "گگڑی" بھی ایسے ہی ایک طبقے کی کہانی ہے۔

گگڑی ایک ایسی عورت ہے جو جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہے اور لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرنا شروع کر دیتی ہے تاکہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔ وہ مہینہ مہینہ نہ تو نہاتی ہے اور نہ ہی اپنا لباس تبدیل کرتی ہے اس لیے لوگ اسے اپنے گھروں میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ اس لیے اسے بھینسوں کے بیلے میں کام کرنا پڑتا ہے اسی بیلے کی آمدنی سے وہ اپنی اولاد کو بڑا کرتی ہے۔ ایک اس کی بہو جب اسے صفائی کا طعنہ دیتی ہے تو وہ یہ بات دل پر لے لیتی ہے اور بیمار ہو کر اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔ جب اس کی بہو کو اس کی عظمت کا ادراک ہوتا ہے تو تب دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ جوانی کی بیوگی بہت خطرناک ہوتی ہے۔ شہر کی ساری ہوس زدہ آنکھیں اس کے ہی جسم کی طرف اٹھنے لگتی ہیں وہ یہ حقیقت جان گئی تھی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے خود گگڑی کے روپ میں رکھا اور خود دار اتنی تھیں کہ زندگی میں کبھی بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا عمر کے آخری حصے میں جب اس کی اولاد جان گئی تو تب انہوں نے خود کو صاف ستھرا رکھنا شروع کیا اور گھر داری بھی بہو کے حوالے کر دی اور زندگی کے امتحان میں سرخرو ہوئی۔

گگڑی جیسی کہانیاں دراصل کسی ذہنی تفریح کے لیے نہیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ کسی تخلیق کار میں کچرے سے ہیرا دریافت کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ تکنیک منٹو کے افسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں یہ تکنیک اپنا انفراد لیے ہوئے ہے:

> "ایک دن بہو کہنے لگی یہ گھر میری سلیقہ شعاری سے سجا ہے میری ساس تو گگڑی ہے اس کو تو کچھ پتا نہیں کہ دنیا کیا ہوتی ہے اور کدھر جا رہی ہے۔ ساری عمر خود بھی میلی رہی گھر بھی میلا رکھا۔ گگڑی سے یہ تہمت برداشت نہ ہوئی۔ صدمے سے فالج کا حملہ ہوا اور گگڑی بیچاری چارپائی سے جا لگی، بیٹوں نے بری خدمت کی، بڑا علاج کیا۔ مگر اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ انگاروں پر چلی، گگڑی کا سوانگ بھرا، کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ اک اونچی ذات کی عورت بیوہ ہو کر بھیڑیوں سے بھری دنیا میں گگڑی کیوں بن جاتی ہے؟"(7)

ہمارے معاشرے میں گگڑی جیسے کردار عورت کے خلاف ہونے والے مظالم کا کھلا احتجاج ہیں جن سے معاشرے کا کوئی بھی باشعور آدمی منہ نہیں موڑ سکتا۔ خوش لباس خاتون جب بے سہارا ہوتی ہے تو اسے سہارا دینے کی بجائے اس کا بدن نوچنے کی خاطر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جاتا ہے اور عورت پر ہونے والا یہ استحصال ہمارے معاشرے کی وہ برائی ہے جس سے کسی صورت بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

"ان ٹیوشن" (Intution) گل مصلوب میں شامل وہ کہانی ہے جو ایک حساس اور آرٹسٹ لڑکی سے متعلق ہے جسے بچپن سے ہی مصوری کا شوق ہے۔ مصوری لاشعوری طور پر اس کے اندر موجود ہے آرٹ کسی انسان کے اندر جنم لیتا ہے یا یہ بھی دوسرے علوم طرح شعوری طور پر سیکھا جاتا ہے یہ ایک الگ بحث ہے۔

جس طرح شاعری کسی نہ کسی زبان میں کی جاتی ہے اسی طرح مصوری بھی تصویروں کی زبان ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ یہ سب زبانوں کی ماں ہے۔ چونکہ حرف اور لفظ بھی تصویروں کو مدِ نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں اس لیے نثر میں یا مصوری میں آرٹ کے متعلق نظریات کو ایک دوسرے فنون کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جسے آج کی اصطلاح میں بین العلومیت کا بھی نام دیا گیا ہے۔

فنون لطیفہ کے بارے میں ماہرین کا جو بھی خیال ہو یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اگر لاشعوری بھی ہے تو تب بھی انسانی شعور سے ہو کر ہی گزرتی ہے۔ جس طرح ایک عام انسان اپنی اندرونی کیفیات اور خود کو درپیش آنے والے واقعات بھانپ لیتا ہے اسی طرح ایک آرٹسٹ بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے مستقبل کا اظہار کر لیتا ہے۔ ان ٹیوشن بھی ایسی ہی ایک آرٹسٹ لڑکی کی کہانی ہے جو لاشعوری طور پر تصویریں بناتی ہے جو بہت ہی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ بعض اوقات وہ خود بھی ان سے ڈر جاتی ہے۔

اس کی مرضی کے خلاف ہمارے معاشرے کی دیگر لڑکیوں کی طرح اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ ایک ماہ بعد اس کا شوہر بیرونِ ملک چلا جاتا ہے اور اس کے گھر کے افراد کچھ دن گزرتے ہی اس کی تخلیقات یعنی تصویری فن پاروں کی وجہ سے اسے سائیکو سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ یہ سب اس کے اُس فن کی سزا ہوتی ہے جس میں حاملہ عورت کے پیٹ میں اس نے خنجر گھونپا ہوتا ہے اور اس کی دیورانی چونکہ حاملہ ہوتی ہے اس لیے اسے لگتا ہے کہ یہ لڑکی اس کے بچے کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ آخر کار یہ حساس لڑکی بھی اس طرح کی مجموعی جہالت کی بلی چڑھ جاتی ہے اور اس کا شوہر اسے وہیں سے ہی طلاق کے کاغذات بھجوا دیتا ہے۔ یوں تصویر میں نظر آنے والا خنجر آخر کار اس کے اپنے پیٹ میں حمل گرنے کی تعبیر بن جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجے:

> "وہ بہت خطرناک عورت ہے تم جانتے ہو تمہاری بڑی بھابھی کئی برس بعد امید سے ہیں اس بدبخت اسالہ نے ایک حاملہ عورت کے خاکے بنا کر اس پیٹ میں خنجر گھونپے ہیں۔ وہ خاکے تمہاری بھابھی کے ہاتھ لگ گئے۔ تمہاری بھابھی سخت غصے میں ہے۔ وہ پاگل نفسیاتی مریضہ ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہنے والی، تمہاری بھابھی کے بچے کی جان لینا چاہتی ہے۔ اسے فوراً طلاق بھجواؤ۔"(8)

اس ظلم کے علاوہ بھی اِس افسانے میں ایک اور رویہ دکھایا گیا ہے جو تخلیقات کو ہیچ اور معمولی سمجھنا ہے۔ ہمارے ہاں لوگ تخلیقی ادب یا کسی بھی فن پارے کو فضول ترین سمجھتے ہیں۔ دنیا جہاں لٹریچر کا احترام کرتی ہے ہمارے ہاں اسے سب سے فضول چیز گردانا جاتا ہے۔ یہاں پر صرف سکل ایجوکیشن کو ہی تعلیم سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ کسی طرح کی بھی تعلیم ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکلز سیکھنے سے ہمارے ہاں لوگ ڈاکٹر اور انجینئر تو بن جاتے ہیں لیکن اچھے انسان نہیں بن پاتے۔ اسی وجہ سے نہ تو مجموعی طور پر یہاں لوگ ایک دوسرے کا احترام کرتے بلکہ اپنے گھروں میں انہوں نے اپنی عورتوں تک کو بھی فٹ بال بنایا ہوا ہوتا ہے۔

یہ متن ہمارے معاشرے میں تخلیقی تحریر، فن اور ادب کی قدر اور احترام کی کمی کو اجاگر کرتا ہے، جہاں صرف روایتی تعلیم اور پیشہ ورانہ ڈگریوں کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت تخلیقی کاموں کے لیے تعریف کی کمی اور اچھے لوگوں کی نشوونما میں ان کی اہمیت کو پہچاننے میں ناکامی کا باعث بنتی ہے

> "کیا تخلیق فطرت کا کوئی کوڈ ورڈ ہے؟ کیا فن وجدان کی کوئی شکل ہے؟
> اگر یہ وجدان ہے تو کیا تخلیق اتنی کم تر ہوتی ہے کہ کچرے میں پھینک دی جائے؟"(9)

دنیا کے مہذب معاشروں کی بات کی جائے تو ان میں ادب کو مذہب سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ایسے معاشروں کے لوگ چاہے عبادت کریں یا نہ کریں لیکن ادب کا مطالعہ روزانہ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

گلِ مصلوب میں شامل افسانہ "کلمہ و مہمل" بھی اسی کیفیت کا اظہاریہ ہے۔اس میں ایک گونگی لڑکی کی زندگی کی مشکلات دکھائی گئی ہیں۔یہ بہت حساس اور اپنے بہن بھائیوں سے بہت زیادہ محبت کرنے والی ہے۔مگر یہ کردار گزشتہ سے زیادہ مضبوط ہے۔یہ کردار نہ صرف پہلے کردار سے زیادہ حساس ہے بلکہ اس کی زندگی میں جو مشکلات کے جھیل پھیلے ہیں وہ انہیں شکست دے دیتی ہے۔زمانے کی تمام تر مشکلات سے لڑ کر وہ اپنی جگہ بناتی ہے حالانکہ یہ مشکلات اتنی آسان نہیں تھیں۔کلمہ و مہمل سے اقتباس ہے کہ: جب ہم مہذب معاشروں کی بات کرتے ہیں تو ادب کو مذہب سے زیادہ فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔لوگ عبادت کریں یا نہ کریں لیکن ادب کا مطالعہ ضرور کریں گے۔"گل مسلوب" میں ایک گونگی لڑکی کی زندگی اور جدوجہد کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو اپنے بھائیوں کے لیے بہت حساس اور محبت کرنے والی ہے۔یہ کردار پہلے سے زیادہ مضبوط ہے، نہ صرف زیادہ حساس بلکہ اپنی زندگی میں آنے والی مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔وہ انہیں شکست دے سکتی ہے۔وقت کی تمام تر مشکلات کے باوجود وہ اپنا مقام پا لیتی ہے اور یہ مشکلات آسان نہیں ہیں۔یہ "کلمہ" (کلمہ) کا ایک اقتباس ہے۔

متن مہذب معاشروں میں ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، جہاں اسے مذہب سے زیادہ فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔"گل مسلوب" میں ایک گونگی لڑکی کی کہانی لچک اور عزم کی ایک زبردست مثال ہے، کیونکہ وہ اپنی زندگی میں بے شمار چیلنجوں پر قابو پاتی ہے اور تمام مشکلات کے باوجود اپنا مقام پاتی ہے

> "میرے سارے بدن میں خوف کی سرد لہر سرایت کرتی چلی گئی میں کیا کروں؟ کیسے خود کو اس شخص کی گرفت سے آزاد کراؤں؟ یہ ملازمہ اسے اندر کیوں بلا لائی اور اب وہ خود کہاں چلی گئی ہے؟ ماں سو رہی ہے اسے کیسے علم ہو گا کہ اپنے ہی گھر میں اس کی بیٹی کو کوئی ہراساں کر رہا ہے۔پھر نہ جانے میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ خود کو اس عفریت کی گرفت سے آزاد کراتے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور چلا کر اونچی آواز میں کہا۔۔۔۔۔آں ما ما۔۔۔۔۔ماما۔۔۔ماما اور وہ عفریت دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔"(10)

ہمارے ہاں قانون کی لاپرواہی کی وجہ سے کسی کو ہراساں کرنا ایک عام سی بات سمجھی جاتی ہے۔اس طرح کے عفریت معصوم لوگوں پر موقع پا کر فوراً جھپٹ پڑتے ہیں۔انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔اس معاشرے قانون آپ کو تحفظ دینے کی بجائے صرف اپنی تنخواہ کھری کرتا ہے۔باقی لوگ اپنی حفاظت خود کریں۔ایسے موضوعات پر سبین علی نے افسانے لکھ کر بہت کچھ بے نقاب کیا ہے۔جہاں وہ مثبت انداز میں وطن عزیز پر اور اس کے اداروں پر فخر محسوس کرتی ہیں وہیں اپنے قلم کے ذریعے خاموشی سے کئی ایک پردے نام لیے بغیر بھی اٹھا لیتی ہیں جو کہ نہایت ضروری ہیں۔یہ خاموش مقصدیت ان کے افسانوں کو نئی جہت فراہم کرتی ہے۔ہمارے قوانین کی عدم توجہی کی وجہ سے کسی کو ہراساں کرنا ایک معمولی سی بات بن گئی ہے۔نتیجتاً، برے لوگ بے گناہ لوگوں پر تیزی سے جھپٹ پڑتے ہیں، اور کوئی بھی ان کے لیے آواز نہیں اٹھاتا۔یہ قانون صرف ان لوگوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے جن کے پاس ایسا کرنے کے ذرائع ہیں، باقی کو اپنے لیے بچانا چھوڑ دیا جاتا ہے۔سبین علی نے اپنی کہانیوں کے ذریعے بہت سی تلخ

حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے، جہاں وہ ملک عزیز کے اداروں کے مثبت پہلوؤں کو فخریہ انداز میں اجاگر کرتی ہیں، وہاں خاموشی کا پردہ اٹھانے کے لیے اپنے قلم کا استعمال کرتے ہوئے موجود ناانصافیوں اور منافقتوں کے خلاف بھی جرات مندی سے آواز اٹھاتی ہیں۔

سبین علی کا یہ افسانوی مجموعہ تانیثی شعور کا حامل ہے۔ اس کے گہرا مطالعہ ایک فکری دعوت ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی شناخت کن نفسیاتی الجھنوں اور معاشرتی ناہمواریوں کا شکار ہے۔ انسانی سطح پر برابری اور مساوات کا یہ فکری دائرہ نہایت تخلیقی ڈھنگ میں پیش کیا گیا ہے جو اردو افسانہ نگاری میں قابل قدر اضافہ ہے۔

حوالہ جات

1۔ گلِ مصلوب،افسانے، سبین علی(لاہور:،عکس پبلی کیشنز،2018،)ص:74

2۔ ایضاً:ص،64

3۔ اردوافسانے کی نئی تنقید،سید محمد عقیل شاہ،ندوین،ڈاکٹر طاہرہ پروین(الہ آباد: انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز) ص:83

4۔ گلِ مصلوب،افسانے، سبین علی،عکس پبلی کیشنز،2018،لاہور،ص:58

5۔ کلیاتِ احمد فراز،احمد فراز،ترتیب وتزئین،فاروق ارگلی،فرید بک ڈپو(پرائیویت)لمیٹڈ،ص:235

6۔ اردوافسانے کی کروٹیں،ڈاکٹرانور سدید(لاہور:،مکتبہ عالیہ) ص:11

7۔ گلِ مصلوب،افسانے، سبین علی،ص: 51

8۔ گلِ مصلوب،افسانے، سبین علی،ص: 41

9۔ ایضاً ،ص :42:

10۔ ایضاً،ص:22